

افکار

(۱)

فاطمین مصر

فاطمین کے مذہب و عقائد کا اب تک نام ہی سنا تھا، یا اپنے ہاں کی کتابوں میں اُن کا ذکر پڑھا تھا، برائیوں اور گمراہیوں کے ساتھ کچھ حالات اُن کے تاریخ مصر میں بھی سرسری پڑھ لئے تھے اور دو ایک کتابیں اُردو میں بھی اُن کے عقائد اور ردِ عقائد پر نظر سے گزر گئی تھیں اور بہ حیثیت مجموعی اب تک اثر یہی پڑا تھا کہ خدا جانے کس درجہ کج رائے اور گمراہ یہ فرقہ ہے، اور ایسے فرقہ خاند کو امت اسلام میں کوئی ادنیٰ درجہ بھی دینا اسلام پر ظلم کرنا ہے۔

اتفاق سے ابھی چند مہینے ہوئے اُن کی ایک اصل کتاب عربی میں اتر آگئی۔ مختصر نام ہے، دعائم الاسلام اور پورا اور طویل نام اگر پڑھیے تو وہ ہے دعائم الاسلام و ذکر الحلال والحرام والقضایا والاحکام عن اہل بیت رسول اللہ علیہ وسلم افضل السلام، کتاب اُن کے ایک مستند و قدیم، فاضل و امام فن قاضی ابی حنیفہ النعمان بن حیون التیمی الغری (متوفی ۳۶۲ھ) کی تصنیف ہے، اور دو جلدوں میں ہے۔ پیش نظر پہلی جلد ہے، اسے ڈاکٹر آصف فیضی (دبئی والے) نے ایڈٹ کر کے کوئی تین سال ہوئے شائع کیا ہے، ضخامت عربی نسخ کے ٹاپ میں ۵۴۵ صفحوں کی ہے، کتاب فقہ دار کا نام اسلام پر ہے اور ان کی فقہ تمام تر حدیث ہی پر مبنی اور اسی سے ماخوذ ہے، البتہ حدیث کے مفہوم میں ان کے ہاں وسعت ہے یعنی رسول کے ساتھ اہل بیت رسول کے بھی اقوال اس میں شامل ہیں، ترتیب کتاب بالکل ہم جہتوں کی کتابوں کی طرح ہے مختصر نمبر سے عنوانات ملاحظہ ہو۔ کتاب اور بیت دعائم اسلام، کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم

والاعتصاف۔ کتاب الحج، کتاب الجہاد، اور پھر ہر باب کے تحتانی عنوان بھی متعدد ہیں۔ دوسری جلد کی بھی فہرست اسی کے دیباچہ میں دے دی ہے۔ اس کے بھی عنوانات ۲۶ ہیں۔ کتاب البیوع، کتاب الاطعمہ، کتاب النکاح، کتاب الطلاق وغیرہ۔

یہ حدیثیں ہم اہل سنت کے معیار سے کس درجہ کی ہیں، کس حد تک حجت شرعی کا کام دے سکتی ہیں۔ وغیرہ۔ اس قسم کے سوالات سے یہاں بحث نہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ہمارے اُن کے بڑا اختلاف ہوگا۔ اختلافات نہ ہوتے تو فاطمیہ کا ایک الگ فرقہ ہی جمہور امت سے کٹ کر کیوں قرار پاتا، اور مسئلے بھی اپنی جگہ اہم ہیں، اور اختلافات کو کالعدم قرار دے دینا ہرگز مقصود نہیں۔ لیکن اہم ترین سوال تو وحید و رسالت ہی کا ہے اور بنیادی مسئلے صرف یہی دو ہیں۔ اس کا اعتراف اس فرقہ کو بھی ہے، اور ان دو اصولوں سے وہ ذرا ہٹنا نہیں چاہتا، اختلافات جو کچھ ہیں وہ تفصیلات و جزئیات میں ہیں۔ اور زیادہ چھان بین کی جائے تو خود اہل سنت کے اندر قدیم اور جدید کتنے فرقے نکلیں گے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا، وحدت امت کے قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ وحدت کلمہ ہی کو معیار اسلام رکھا جائے اس کے رد و قبول پر حکم کفر و اسلام کا لگایا جائے، اور اختلافات تعبیرات کے تلخ ذائقہ کو جوں توں برداشت کیا جائے، وحدت کلمہ بڑی چیز، بہت بڑی چیز، سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کی عظمت دل میں پوری طرح اُتر جائے۔ تو دوسرے سارے مسئلے نسبتاً خفیف ہی نظر آنے لگیں گے، اور تحزب دکھ اسی کا صحیح نام، فرقہ داریت ہے، جسے کم استعداد اخبار والوں نے بالکل دوسرے معنی میں چلا دیا ہے، کی خود کار تلوار کند ہو کر رہ جاتے گی۔

الہ آباد کے مارف شاعر نے کیسی پتے کی بات کہہ دی ہے۔

ہر شیخ یہ کہتا ہے، عقائد میں تو یہ ہیں

توحید یہ کہتی ہے، زوائد میں تو یہ ہیں

(ہفتہ وار "سندقی جدید" لکھنؤ)

۳۔ جون ۱۹۶۶ء

اسلام زندگی کا ایک انقلاب آفریں تصور پیش کرتا ہے

حصاری ذہنی زندگی پر آج ایک غدار سامستولی ہے۔ کیوں کہ ہمارا یہ عہد قحط الرجال کا عہد ہے، پختہ افکار رکھنے والے خال خال ملتے ہیں۔ ہمارا عہد جس نے اُتلاف (SYNTHESIS) کا ہم سے مطالبہ کر رہا ہے، ابھی تو اس نے اُتلاف کی کہیں پر چھائیں بھی نظر نہیں آتیں۔

میں اسلام کی فکری تاریخ میں تغیر، حرکت اور ارتقار کے موضوع پر مواد جمع کر رہا ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ یہ مواد خود قرآن کریم اور احادیث میں ملا ہے۔ قرآن مجید چوں کہ حیاتِ انسانی کی مثالی جدوجہد کا آئینہ دار اور رہنما ہے۔ لہذا اس میں حیات کے دل دھڑکن سب سے زیادہ تیز ہے، اور حقیقی بھی ہے۔ اتساع اور خطابت سے پاک، قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی (APPROACH) مابعد الطبیعیاتی نہیں، بلکہ واقعاتی ہے۔ اس کا مطمح نظر کائنات اور حیات کی محض تشریح کرنا نہیں، بلکہ اُسے بدلنا ہے، مابعد الطبیعیاتی منطق فکری سکون پیدا کرتی ہے، اس نے قرآن مجید نے اس کے بجائے واقعاتی منطق کے عمل اور انقلاب کی اپیل کو اپنایا ہے۔

یہ بات قطعاً غلط ہے کہ حقیقتِ اولیٰ کی نقاب کشائی صرف مابعد الطبیعیاتی طریق تحقیق ہی کر سکتا ہے، اگر ہم حقیقتِ اولیٰ کو تخلیق و ارتقار کا مصدر تسلیم کر لیں تو مذکورہ تحقیق کے طریق کی کامیابی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ یہ طریق تحقیق ایک ایسے وجود کے متعلق ہی ہمیں معلومات ہم پہنچا سکتا ہے، جو فکر محض ہو جس طرح ہندو فلسفہ میں سستی کو حق (ست، فکر و چیت)، اور سکون (آند) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

میرے خیال میں قرآن حکیم نے سستی مطلق کو حق قرار دینے کے ساتھ ساتھ اُسے فکر محض تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور فکر کو اس کی ایک تدریقاتی قرار دیا ہے لیکن یہ فکر ہمہ وقت اس کے تخلیقی عمل میں اپنے آپ کو ڈھالتا رہتا ہے۔ اس لئے سکون اپنے روایتی معنوں میں سستی مطلق کی تدریقاتی نہیں بن سکتا، لہذا ایسی حقیقتِ اولیٰ جو فعلیتِ مطلقہ کی شکل میں ہمارے سامنے آئے اور جس کی تخلیقی صلاحیتوں کی یہ حالت ہو کہ اگر تمام درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر روشنائی اور ایسی لاتعداد قلمیں اور سمندر ختم ہو

جائیں، مگر اُس کی اقدار کی تحقیق نہ ختم ہو تو ایسی ہستی یا فعلیت کے مطالعہ کے لئے ہمیں ایسے طریق کی ضرورت ہے، جو اُسے اُس کے عمل اور اس کی انقلاب آفرینی۔ پس منظر میں رکھ کر اس کا مطالعہ کر سکے۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام کی اکثریت ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکی۔ حال ہی ڈاکٹر فضل الرحمان نے زکوٰۃ پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن پر حضرات علماء کی طرف سے جو ردّ عمل ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ بزرگ اس بات کو نہیں جانتے کہ وہ ایک ایسے عہد میں سانس لے رہے ہیں جس میں وجود اور اُس کے مظاہر کی توجیہہ ”زمان کی مقدار“ کو جمع کئے بغیر ناممکن ہے، عمیق مطالعہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ زمانی بُعد دراصل باقی تینوں ابعاد کو بردئے کا لاتا ہے، یعنی اگر زمان نہیں تو طول، عرض و عمق کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زمان کے دونوں پہلوؤں یعنی زمان متسلسل اور زمان خالص کو بیان فرمایا ہے۔ ”لا تسبوا الدهر“ والی حدیث اگر زمان متسلسل پر روشنی ڈالتی ہے، تو وہ حدیث جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ میرے اور اللہ کے درمیان ایسے لمحات آتے ہیں، جن میں ملک مقرب اور نبی مرسل بار نہیں پاسکتا ”زمان خالص کے تصور کو ہمارے سامنے لاتی ہے، جو کتاب اور اس کی حامل شخصیت ایسے انقلاب آفرینی تصورات کی مالک ہو، انہیں علماء کا اپنے جمود اور قدامت پسندی کے لئے سدِ بنا ناکس قدر حیرت انگیز ہے۔

ہمارے اکثر علماء میں ایک انتہائی خطرناک روایت ترویج پا چکی ہے کہ وہ یوں تو قرآن مجید کی تمام آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب احادیث کو مانتے ہیں، مگر معاشرتی زندگی پر انہیں تطبیق کرنے سے جو منطقی نتائج مترتب ہوتے ہیں، انہیں تسلیم کرنے سے گریز فرماتے ہیں اور یہ شاید اس لئے کہ ان نتائج کے مان لینے سے انہوں نے اپنی جو دنیا بنا رکھی ہے، اُس کے درہم برہم ہونے کا اُن کو ڈر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے زکوٰۃ کے متعلق اپنا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے، وہ کلی طور پر مشکِ مذہبی ہو، لیکن آخر اس میں کیا حرج ہے کہ زکوٰۃ جیسے اجتماعی عمل پر آج کے اجتماعی حالات کی روشنی

میں غور کیا جائے، ڈاکٹر صاحب نے زکوٰۃ کی فرضیت سے تو انکار نہیں کیا، البتہ انہوں نے اس کی حدود کو وسیع کرنے کی رائے دی ہے۔

زکوٰۃ کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کے رد میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُسے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے علماء متدلس صحائف کی تشریح و تعبیر تو ضرور کر سکتے ہیں، مگر اپنے تخلیقی عمل سے انہیں زندہ حقیقت میں نہیں بدل سکتے اور نہ وہ ماضی کے مقدس ورثے میں کسی قسم کا اضافہ کر سکتے ہیں، ہمارے یہ بزرگ اب تک یہ نہیں سمجھے کہ وجود اور اُس کے مظاہر زمان کی تخلیقی حرکت سے ہر دم تجدد پذیر ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہی انقلاب آفریں تصورات کو پیش فرما کر اپنی دوامیت پر مہر ثبت کر دی ہے، انہیں تصورات کی مدد سے فارابی، ابن باجر اور ابن طفیل نے یونانی فلسفہ پر تنقید کی اور بعد میں سپین کے راستے یہ تصورات ہیگل، برگساں اور آئن سٹائن تک پہنچ کر اپنی انتہائی مکمل شکل میں ظہور پذیر ہوئے۔

ڈاکٹر فضل الرحمن سے ہزار اختلاف کے باوجود، انہوں نے ان سالوں میں جو بخشیں اٹھائی ہیں، میں اُن کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس سے کم از کم فکری جمود تو ٹوٹے گا، اور ہمارے علماء ان امور پر سوچنے کی زحمت کریں گے، جنہیں وہ حرفِ آخر سمجھ کر اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں، اور یوں بھی ارشادِ ربّانی ہے۔ قُلْ نَقْذِفْ بِالْحَقِّ عَلَىٰ الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَالْهَوُ نَرَاهُ قُلْ، جب مختلف آراء کا آپس میں تصادم ہوتا ہے تو جو رائے مبنی برحق ہوتی ہے وہ غالب آتی ہے، اور جو باطل ہوتی ہے، وہ دب کر رہ جاتی ہے۔

میں ڈاکٹر فضل الرحمن کی ہر رائے پر صاف نہیں کرتا، البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ انہوں نے سنتِ حدود اور زکوٰۃ جیسے مسائل کے بارے میں بحث کا دروازہ کھول کر سب لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، یہ اُمتِ اسلامیہ کے حق میں اچھا ہے بُرا نہیں۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے کے بغداد اور دس سو سال پہلے کی دہلی میں علمی و دینی بحثوں کے لئے اس قسم کی آزاد فضا تھی، جس نے امام غزالی اور امام ولی اللہ جیسے مجددینِ ملت کو پروان چڑھایا، علمی بحث سے زندہ نہیں پھیلتا، یہ جمود ہوتا ہے جو زندہ کی شکل میں آخر کار پھٹتا ہے۔

آپ کو یاد دلاؤں، آپ ہی کے رسالے ”فکر و نظر“ میں جو رابطہ العالم الاسلامی نمبر تھا۔

جناب احمد زکی یمانی وزیر پٹرول و معدنیات مملکت سعودی عرب کا ایک مقالہ ”عدل اجتماعی اور اس کی اسلامی بنیادیں“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اُس میں وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”زکوٰۃ کہاں کہاں خرچ ہو، قرآن مجید نے ان مصارف کی یوں وضاحت کی ہے:-

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمولفۃ قلوبہم و فی السرقاب والغارمین و فی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ ربہ شک صدقات تو صرف حق ہے غریبوں اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان پر متعین ہیں اور جن کی دل جوئی کرنا ہے، اور گردنیں چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضے میں اور جہاد میں اور مسافروں میں (

”یہ ایک امر مسلم ہے کہ زکوٰۃ کے بعض مصارف اب ختم ہو گئے ہیں جہاں تک ”مولفۃ قلوبہم“ کا تعلق ہے، حضرت عمر کے عہد خلافت سے انہیں زکوٰۃ سے حصہ نہیں دیا جا رہا۔“ فی السرقاب“ یعنی غلاموں کا قصہ اب پُرانا ہو گیا ہے، اس کی حیثیت محض تاریخی رہ گئی ہے، اور غلام سرے سے رہے نہیں، رہے ”العاملین علیہا“ یعنی زکوٰۃ کی تحصیل کا کام کرنے والے، تو وہ اب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور سرکاری خزانے سے ان کو تنخواہ ملتی ہے، اس لئے ان پر زکوٰۃ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے اب زکوٰۃ کی ساری رقم بیت المال میں جائے گی تاکہ اس سے کفالت اجتماعی کی ضرورتیں پوری ہوں“

یہ سعودی حکومت کے، جو کافی تک قدامت پسند ہے، ایک ذمہ دار وزیر کی رائے ہے، جس کا اُس نے ایک عالمی اجتماع میں اظہار کیا۔

ڈاکٹر فضل الرحمن نے نفس زکوٰۃ کو ایک عمومی ٹیکس قرار دیا ہے، جو ایک اسلامی حکومت اپنے عوام سے وصول کرنے کی مجاز ہے۔ اس مسئلے پر بحث ہو سکتی ہے، اور ہونی چاہیے، اس پر جبرک اٹھنا علمی تحقیق سے بعید ہے۔

والسلام

الطاف جاوید

مارٹن روڈ، کراچی۔